خطبات بہاولپور: ایک تاریخی دورہ کی چند جھلکیاں

عذرا نسیم فاروقی ☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی شخصیت نہ صرف مسلمان اہل علم و دانش کے لیے بلکہ دین و ملت کے مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے عام مسلمانوں کے لیے بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ گزشتہ صدی کی ان بزرگ ترین شخصیات میں شامل ہیں جن کی یاد اس صدی کے افق پر ہمیشہ ایک تابناک ستارہ کی طرح چمکتی رہے گی اور ان کے علمی کارنامے اور دعوتی کامیابیاں اس صدی کا اہم ترین حوالہ ہوگا۔

ایک عالم بے بدل اور ایک داعی بے مثال تو آپ تھے ہی اور ایک زمانہ آپ کی ان خوبیوں کا مداح ہے، مگر اس کے علاوہ بلکہ شاید اس سے بڑھ کر آپ مکارم اخلاق اور روحانیت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ جیسا کہ آپ کے ہم عصر علماء وصلحاء اور فضائل انسانیت کے جوہر شناسوں نے آپ کے بارے میں گواہی دی اور دیتے رہیں گے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بھرپور اور ہمہ جہت شخصیت کا ہر ہر پہلو اس قدر بھرپور اور شان دار ہے کہ اس کا احاطہ ایک مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ آنے والے ایام میں لکھنے والے ان کے بارے میں لکھتے رہیں گے اور ان کی قابل رشک کامیاب زندگی کے نئے نئے گوشے سامنے لاتے رہیں گے۔ اس مختصر تحریر میں ان کی جگمگاتی ہوئی شخصیت کی بعض روشن جھلکیاں ایک تاریخ ساز واقعہ کے حوالہ سے دکھانے کی ایک ادنیٰ کوشش کی گئی ہے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کا اظہار مختلف شکلوں اور متنوع رنگوں میں ہوتا رہتا ہے۔ خالق کائنات کے فضل و کرم کے مظاہر لاتعداد ہیں۔ ان میں شاید اہم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ خلاق عظیم انسانوں کے اندر بعض ایسی غیر معمولی شخصیتوں کو پیدا فرماتا رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور روشنی کے مینار بن کر بھٹکتی ہوئی انسانیت اور بہکتی ہوئی بشریت کے سامنے علم و معرفت اور اخلاق و سیرت کی شمعیں روشن کر کے ان کو دوبارہ سیدھے راستے کی طرف لے آتے

☆ ۵۶۴، سٹریٹ نمبر ۱۲، شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد

ہیں۔ ایسی عظیم الشان اور نادر روزگار ہستیوں کو پہچاننا اور ان کے وجود مسعود سے استفادہ کرنا انسانوں کے لیے باعث سعادت اور موجب خیر و برکت ہوتا ہے۔ ان حضرات سے زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرنا دراصل ان کی قدر افزائی کے مترادف ہوتا ہے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ایک بے بہا نعمت کا اعتراف ہوتا ہے۔ مالک و مولیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا تذکرہ وہ فریضہ ہے جو ہم سب پر اس کی جانب سے عائد کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

واما بنعمة ربک فحدّث

جس طرح دین اسلام بے شمار منفرد اور ممتاز خصوصیات رکھتا ہے اسی طرح ہم مسلمانوں کی ایک مخصوص تاریخ بھی ہے جو تمام دیگر مذاہب اور ملتوں کی تاریخ سے مختلف ہے اور ایک بے مثال حیثیت کی حامل ہے۔ اس تاریخ کا نمایاں ترین اور امتیازی وصف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ مثالی معاشرہ اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے علوم و معارف اور فضائل و مکارم کا جو سرچشمۂ فیض جاری ہوا تھا اس سے حاصل کردہ دینی علوم اور روحانی معارف کا سرمایہ حد درجہ احتیاط اور مکمل استناد کے ساتھ ۱۵ صدیوں کا سفر طے کرتا ہوا نسلاً بعد نسل ہم تک بحفاظت پہنچا ہے۔ اس بے بہا سرمایہ کو جس حزم و احتیاط کے ساتھ علماء امت نے آئندہ نسلوں تک منتقل کیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی معاشرہ یا تہذیب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ علم نافع اور عمل صالح کے باہم اشتراک و ارتباط کے ساتھ تاریخ اسلام کی شاہراہ پر اُمت کا یہ تہذیبی سفر مختلف منزلیں طے کرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ سفر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج بھی جاری ہے اور ان شاء اللہ تاقیامت جاری رہے گا۔

۱۵ صدیوں پر محیط یہ دینی اور روحانی، ثقافتی اور تہذیبی سفر جن ذرائع اور وسائل کی مدد سے طے کیا جاتا رہا ان میں تصنیفات، تراجم، مواعظ، دروس، تقاریر اور خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ہماری حالیہ تہذیبی اور علمی تاریخ کی ایک اہم روایت ''خطبات'' کی بھی رہی ہے۔ مختلف موضوعات پر علوم اسلامیہ کے ممتاز علماء اور ماہرین کے سلسلۂ ہائے خطبات کا اہتمام اور ان کی اشاعت و ترویج کا انتظام ہماری علمی زندگی کا ایک اہم اور مفید حصہ رہا ہے۔ ماضی قریب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ سیّد سلیمان ندویؒ، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، علامہ محمد اقبالؒ، محمد مارماڈیوک پکتھالؒ اور محمد الخضری بکؒ کے خطبات کو خاص طور پر اہل علم میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ بعض حضرات کے دیئے ہوئے خطبات کو ان کی باقاعدہ تصنیف کردہ کتب سے کہیں زیادہ مقبولیت ملی۔ ان خطبات کو نہ صرف اپنے اپنے موضوعات پر ایک مستند مأخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی بلکہ ان خطبات نے مسلمانوں کی علمی، فکری، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر

دور رس اور قابل ذکر اثرات مرتب کیے۔ طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان خطبات کی افادیت میں کمی نہیں آئی۔ ان میں بعض خطبات ایسے ہیں جو آج بھی اپنے موضوعات پر ایک اہم حوالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالقیوم قریشی صاحب نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے مراسلت کا آغاز کیا اور آپ کے ساتھ پندرہ روز پر محیط خطبات کا ایک پروگرام طے کر لیا۔ یہ پروگرام بارہ خطبات پر مشتمل تھا جو ۸ مارچ ۱۹۸۰ء سے ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء تک ہونا قرار پائے۔ موضوعات ڈاکٹر صاحب نے خود ہی طے فرمائے جن کی ترتیب یہ تھی:-

۱۔ تاریخ قرآن مجید
۲۔ تاریخ حدیث شریف
۳۔ تاریخ فقہ
۴۔ تاریخ اصول فقہ و اجتہاد
۵۔ قانون بین الممالک
۶۔ دین (عقائد، عبادات، تصوف)
۷۔ مملکت اور نظم و نسق
۸۔ نظامِ دفاع اور غزوات
۹۔ نظامِ تعلیم اور سرپرستی علوم
۱۰۔ نظام مالیہ و تقویم
۱۱۔ تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ

اس موقعہ پر ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے قیام کا انتظام سرکٹ ہاؤس بہاولپور میں کیا گیا تھا۔ جامعہ کی طرف سے شعبہ علوم اسلامیہ کے استاد جناب محمد یوسف فاروقی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کے انتظامات کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اولڈ کیمپس کی قدیم عمارت کے غلام محمد گھوٹوی ہال میں یہ تاریخی خطبات منعقد ہوئے۔ روزانہ عصر سے مغرب تک خطبہ کا وقت مقرر تھا۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی نماز کا وقفہ ہو جاتا۔ نماز مغرب باجماعت ادا کی جاتی۔ اس کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشاء کی اذان تک علمی افادہ اور استفادہ کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔

مقررہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر محمد حمیداللہ تشریف لے آئے۔ سات مارچ ۱۹۸۰ء کو علی الصبح کراچی سے ملتان آنے والے جہاز سے آپ ملتان کے ہوائی مستقر پر اترے۔ اس سے قبل علی الصباح بلکہ یوں کہیے کہ اذانوں کے وقت آپ پیرس سے پی آئی اے کے جہاز پر ساری رات سفر کر کے کراچی پہنچے تھے۔ ان دنوں میں ملتان ہی کا ہوائی اڈہ اہل بہاولپور کے بھی زیر استعمال رہتا تھا کیوں کہ بہاولپور میں ہوائی اڈہ کی سہولیات اس وقت تک میسر نہ تھیں۔

جامعہ اسلامیہ کی جانب سے ملتان کی طیران گاہ پر جناب محمد یوسف فاروقی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا اور انہیں جامعہ کی مہیا کردہ گاڑی میں ان کی مجوزہ قیام گاہ یعنی سرکٹ ہاؤس بہاولپور لے آئے۔ یہ کشادہ، پرتکلف اور قدرے قدیم عمارت عموماً سرکاری افسران اور جج صاحبان کے سرکاری دوروں میں ان کی رہائش کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے اس عمارت میں موجود وی آئی پی سویٹ مخصوص کیا گیا تھا۔ اسی میں ۱۵ دن تک آپ کا قیام رہا۔

اگلے روز ۸ مارچ کو بعد نماز عصر پہلے لیکچر کا آغاز ہونا تھا۔ سہ پہر ہی سے لیکچر ہال کے اردگرد طالبان علم کی رونق اور سامعین کی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ عصر کی نماز کے فوراً بعد ہی سامعین نے جوق در جوق ہال کا رخ کیا اور کئی سو نشستیں دیکھتے ہی دیکھتے پُر ہوگئیں، اس کے ساتھ اس ہال کے چاروں طرف بنی ہوئی بالائی گیلریاں بھی کھچاکھچ بھر گئیں۔ یہ منظر دیکھ کر منتظمین نے ہال کے باہر بھی کرسیاں لگوا دیں مگر ڈاکٹر صاحب کی گفتگو شروع ہونے تک یہ اضافی کرسیاں بھی کم پڑ جاتی تھیں اور بہت سے حضرات گفتگو تک کھڑے کھڑے ہی ہمہ تن گوش رہتے۔

ان پُرجوش اور مشتاق سامعین میں ہر عمر اور طبقہ خیال کے لوگ موجود ہوتے۔ یونیورسٹی کے بیشتر اساتذہ کرام اور طلباء و طالبات تو پابندی سے آیا ہی کرتے، ان کے علاوہ جج صاحبان، وکلاء، قانون داں حضرات، سیاسی شخصیات اور شہر کے دیگر معززین اور ممتاز حضرات کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ تعلیم یافتہ خواتین حتیٰ کہ خالص گھریلو اور خانہ دار خواتین کی بھی خاصی بڑی تعداد ڈاکٹر صاحب کے خطبات کو سننے کے لیے جوق در جوق آتی رہی، اور آخری خطبہ تک یہ جوش و خروش اور بھرپور حاضری کی سطح اسی طرح برقرار رہی۔ بہاولپور شہر میں ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری کچھ ایسی بابرکت تھی کہ ان دنوں شہر میں ایک خاص قسم کی رونق محسوس ہوتی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ہی صادق ایجرٹن کالج، قائداعظم میڈیکل کالج، گورنمنٹ کالج، ڈگری کالج اور اندرون شہر کے دیگر تعلیمی اداروں سے وابستہ اساتذہ اور محققین الگ الگ اور ٹولیوں کی شکل میں اکثر اپنے اپنے اداروں کی بسوں میں

بھر کر اولڈ کیمپس پہنچنا شروع ہو جاتے۔ اس موقعہ پر وقت کی پابندی کا بھی خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مصروف ترین سیاسی زعماء اور سماجی رہنما بھی اپنی گوناگوں مصروفیات اور مشاغل کو ترک کر کے پوری پابندی اور دلچسپی کے ساتھ ان تاریخی خطبات کو سننے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ یوں کہیے کہ ان دنوں بہاولپور شہر کے اہل علم اور ارباب دانش کا سارا جوہر قابل سمٹ کر اسلامی یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے گرد دیوانہ وار جمع ہو جاتا تھا۔ حاضرین کے اندر غیر معمولی جوش و خروش اور ذوق و شوق کی غیر معمولی کیفیات اور والہانہ جذبات اور ولولوں کا ایک ناقابل فراموش منظر دکھائی دیتا تھا۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بہاولپور جیسے چھوٹے سے شہر میں ایسا سنجیدہ علمی اجتماع جس میں عام لوگوں کو بھی شرکت کی کھلی دعوت دی گئی ہو اتنے بڑے پیمانے پر شاید پہلی مرتبہ ہی منعقد ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود لوگوں کو بڑی تعداد میں شرکت کرتے دیکھ کر یوں لگتا جیسے اس طرح کے اجتماعات یہاں کی زندگی کا ہمیشہ سے معمول رہے ہوں۔ اس کی ایک ہی توجیہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ محض ڈاکٹر صاحب کے اخلاص و للّٰہیت اور آپ کی غیر معمولی پُرکشش اور نابغہ روزگار شخصیت کے اثرات تھے۔

اسلامیہ یونیورسٹی کے غلام محمد گھوٹوی ہال میں یقیناً پہلے بھی ممتاز اور معروف ملکی اور غیر ملکی شخصیات تشریف لاتی رہی ہوں گی مگر ڈاکٹر صاحب کی شان ہی کچھ نرالی تھی۔ آپ کے لیے سامعین کے دلوں میں محبت اور عقیدت کے جو جذبات موجزن نظر آتے تھے ان کی شدت اور گہرائی کو آج ۲۳ برس گزر جانے کے بعد الفاظ کے قالب میں سامنے لانا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔

یہ وہ فضا تھی جس میں ۸ مارچ ۱۹۸۰ء سے ان تاریخی خطبات کا آغاز ہوا اور سوائے جمعۃ المبارک کی تعطیل کے روزانہ بغیر کسی وقفہ کے ۲۰ مارچ تک علم و عرفان کی یہ پُرنور بارش اہل بہاولپور کو سیراب کرتی رہی۔ ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ حاضرین کی کثرت تعداد کے باوجود پابندی اوقات، نظم و ضبط، صبر و سکون، توجہ اور یکسوئی اور ذوق و شوق کا جو عالم پہلے خطبہ میں نظر آیا اس میں آخری خطبہ تک نہ صرف یہ کہ کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

جیسے ہی ڈاکٹر صاحب خطبہ دینے کے لئے ہال میں داخل ہوتے تو یکدم خاموشی چھا جاتی۔ حاضرین کی نگاہیں اس پیکر علم و عرفان کے ایمان و ایقان سے معمور روشن چہرہ پر مرکوز ہو جاتیں۔ ڈاکٹر صاحب نشستوں کے درمیان سے گزرتے تو دونوں طرف بیٹھے ہوئے منتظر اور مشتاق سامعین کی

خیر مقدم کرتی ہوئی نگاہوں کو خندہ پیشانی اور مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتے ہوئے گزرتے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کی پر اثر تلاوت کے بعد روازنہ اس مبارک اور مسعود محفل کا آغاز ہوتا۔ تلاوت کے فوراً بعد بغیر کسی تمہید کے ڈاکٹر صاحب کو لیکچر کی دعوت دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب غیر معمولی عاجزی اور بے مثال سادگی کا پیکر تھے۔ گفتگو کا انداز نہایت سادہ مگر شیریں اور شگفتہ تھا۔ آپ کی ہر ہر ادا اور انداز سے تواضع کا اظہار ہوتا اور ہر بول سے انکساری ٹپکتی تھی۔ آپ کی موجودگی میں تشنگان علم پر بجائے علمیت کی ہیبت سوار ہونے کے ایک طرح کی شفقت پدری کا احساس ہوتا تھا۔ اسٹیج پر تشریف لاتے ہی اپنے مخصوص دھیمے اور پروقار لہجے میں انتہائی شائستگی کے ساتھ السلام علیکم کہتے اور خطبہ کا آغاز فرما دیتے تھے۔ تقریباً پچھتر منٹ تک ایمان و ایقان سے سرشار یہ مرد قلندر اور اس دور کا عظیم داعی اسلام، مفکر، معلم اور محقق انتہائی عالمانہ انداز میں ایک حیرت انگیز ربط، محکم ترتیب اور منطقی تسلسل کے ساتھ گفتگو کرتا رہتا۔ پھر حیرت اور استعجاب کی بات یہ ہے کہ ایسی عالمانہ اور فاضلانہ اور اس قدر محققانہ گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب کے سامنے کوئی تفصیلی تحریر تو کجا کاغذ کا کوئی معمولی پرزہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اپنی خداداد یادداشت اور مضامین گفتگو پر غیر معمولی گرفت کی مدد سے بولتے چلے جاتے۔ مجال ہے کہ ایک لفظ یا جملہ کبھی دہرانے کی ضرورت پیش آئی ہو یا کوئی عبارت غیر ضروری طور پر منہ سے نکل جائے حتیٰ کہ ضروری سنہ تاریخیں اور اعداد و شمار بھی ڈاکٹر صاحب کو زبانی یاد رہتے۔ لگتا تھا کہ علوم و معارف کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ آپ اپنے ہر خطبہ میں بیش بہا معلومات و مطالب اور حکمتوں کا ایک خزانہ لٹا دیا کرتے۔ یوں لگتا تھا کہ علمی حقائق اور فکری معارف اور نکات کی ایک موسلا دھار بارش ہے جو سامعین کے قلوب و اذہان کو سیراب کر رہی ہے۔

اس طرح آپ سارا خطبہ فی البدیہ انداز میں بے تکلفی کے ساتھ دیتے چلے جاتے۔ انداز گفتگو سیدھا سادا اور دلنشیں تھا۔ نہ تو آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ، نہ لہجے میں کسی تھکاوٹ یا اضمحلال کے آثار نظر آتے اور نہ ہی الفاظ کی نشست و برخاست میں ذرا جھول محسوس ہوتا، اس دوران سامعین پوری دلچسپی، خاموشی اور انتہائی انہماک کے ساتھ آپ کے خیالات عالیہ کو سنتے۔ ان خطبات کی صدابندی کا اہتمام جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے علاوہ ریڈیو پاکستان بہاول پور کی طرف سے بھی کیا گیا تھا۔ جامعہ کی بعض طالبات نے بھی ذاتی طور پر ان خطبات کو محفوظ کرنے کا انتظام کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب روزانہ ایک نئے موضوع پر خطبہ کا ایک جامع خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر کے

تشریف لاتے۔ روز کا یہ مشاہدہ تھا کہ مقررہ وقت پر ڈاکٹر صاحب انتہائی منطقی ترتیب کے ساتھ اپنے موضوع پر گفتگو شروع کرتے اور جونہی مغرب کی اذان سنائی دیتی اس وقت تک موضوع کے تمام اجزاء بھی بخوبی مکمل ہو چکے ہوتے اور خطبہ اختتام پذیر ہو جاتا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کا لیکچر مقررہ وقت کے اندر ختم نہ ہوا ہو اور نہ ہی یہ ہوا کہ کسی دن گفتگو طویل ہو گئی ہو اور کبھی مختصر رہ گئی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان خطبات میں سے ہر خطبہ اپنے موضوع پر ایک مکمل جامع اور مانع تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مندرجات میں اس موضوع کے تمام ضروری پہلوؤں کا نہ صرف یہ کہ بخوبی احاطہ ہو جاتا ہے بلکہ کہیں کسی غیر ضروری چیز کا اضافہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ آج تقریباً ربع صدی گزر جانے کے بعد بھی ان خطبات کی معنویت اور افادیت اسی طرح تروتازہ ہے اور اہل علم کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہے۔

لیکچر کے فوراً بعد لیکچر ہال سے متصل سبزہ زار پر نماز مغرب باجماعت ادا کی جاتی تھی۔ سلسلہ خطبات کے آغاز ہی میں جامعہ کی انتظامیہ کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ وہ حاضرین کو اپنی اقتداء میں نماز مغرب ادا کرنے کی سعادت بھی بخشیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت فرما دی اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔ اس کا واحد سبب ڈاکٹر صاحب کی مخصوص عاجزی اور منکسرالمزاجی ہی تھی۔ عالم اسلام کے اس عالم باعمل کے اس طرزِ عمل میں ان لوگوں کے لئے کتنی قابل غور مثال ہے جو اپنے کو امام کے مقام پر فائز کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔ بلکہ بعض بدنصیب تو از خود لپک کر امامت کا مصلّٰی اچک لینے سے بھی نہیں چوکتے۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے میزبانوں کے جلو میں دوبارہ ہال میں تشریف لے آتے۔ اس وقت تک تمام سامعین اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہوتے تھے۔ ان کی جانب سے پیش کردہ تحریری سوالات کا ایک ڈھیر کاغذ کے پرزوں کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے ڈائس پر پہلے ہی سے رکھا ہوتا۔ ہر لیکچر کے بعد کثرت سے سوالات کئے جاتے تھے جس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو نہ صرف پوری توجہ سے سنا گیا ہے بلکہ حاضرین ان موضوعات و مسائل میں گہری دلچسپی بھی لے رہے ہیں۔ سوالات کرنے والوں میں ہر سطح کے لوگ شامل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بہت سے سوالات طالبعلمانہ انداز کے ہوتے یا سنجیدہ علمی استفسار کے حامل ہوتے وہیں کچھ سوالات علمی معیار سے فروتر بھی ہوتے تھے۔ بیشتر سوالات تو موضوع سے متعلق ہی ہوتے مگر بعض موضوع سے ہٹ کر بھی کر دیئے جاتے تھے۔ کسی بہت اچھے علمی استفسار پر

ڈاکٹر صاحب اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے: ''اچھا سوال ہے! اکا دکا ایسے سوالات بھی کیے گئے جو بہت ہی سطحی اور عامیانہ قسم کے تھے۔ کسی ناگوار اور غیر معیاری سوال کا جواب دینے سے پہلے انتہائی نرم لہجہ میں یہ فرماتے: ایک سوال ہے، اچھا ہوتا اگر نہ کیا جاتا۔ بہرحال سوال کسی بھی نوعیت یا معیار کا ہوتا آپ اس کو بڑے اہتمام اور سنجیدگی سے لیا کرتے اور پوری توجہ کے ساتھ اس کا جواب دیتے تھے۔

سوال جس نوعیت کا بھی رہا ہو، ڈاکٹر صاحب نے اپنے اعلیٰ تہذیبی معیار میں ذرا کمی نہ آنے دی۔ کسی نامعقول بات پر نہ تو آپ کا لب و لہجہ بدلتا، نہ آواز میں ذرا بھی ترشی یا تلخی کا شائبہ ہوتا اور نہ ہی انداز گفتگو میں کوئی تیزی آتی۔ جواب دیتے ہوئے الفاظ کا انتخاب بہت جچا تلا ہوتا۔ سوال سننے کے بعد عموماً یوں جواب کا آغاز فرماتے: اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں، کسی اختلافی مسئلہ پر کوئی سوال آتا تو جواب اس طرح شروع کرتے: میری رائے یہ ہے، ضروری نہیں کہ آپ اس سے متفق ہوں، اختلافی امور میں بھی اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنا تو درکنار اس رائے کی برتری کا ادنیٰ سا زعم بھی آپ کے انداز تقریر میں نہ جھلکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کی ساری چمک دمک آپ کی غیر معمولی عاجزی اور انکساری ہی سے منور تھی۔ آپ حدیث مبارک ''من تواضع لله رفعه الله'' کی عملی تصویر نظر آتے تھے۔ بسا اوقات جواب دینے کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سوال کرنے والا ان کا استاذ ہے اور وہ خود اس کے شاگرد ہیں۔ سوال و جواب کے پورے دورانیہ میں احترام انسانیت اور اکرام مومن کی روح ہر دوسرے کسی خیال پر غالب نظر آتی تھی۔ کسی کی کم علمی یا کج فہمی پر ذرہ برابر بھی ناگواری، ادنی تعریض یا ہلکے سے طنز کی کوئی جھلک بھی کبھی آپ کی گفتگو یا انداز میں محسوس نہ ہوئی۔ سوال کرنے والا خواہ کسی بھی علمی سطح کا فرد ہو لیکن اس کو ہمیشہ اپنے سے اونچے مقام پر رکھ کر ہی بات کرتے۔ الغرض آپ کے ہر عمل، ہر انداز اور ہر ادا میں علمی وقار، قلب کی صفائی، نیت کی سچائی اور اخلاص عمل کی روشنی نظر آتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس علمی سیر اور فکری پرواز میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد فکری رجحانات کے حامل افراد شریک تھے۔ ان حضرات کی علمی سطح، ذہنی استعداد اور فکری رجحانات میں خاصا تنوع اور فرق بھی پایا جاتا تھا، مگر ان تمام سامعین میں ہر ایک ڈاکٹر صاحب کی طرف سے برابر عزت و توقیر کا سزاوار ہوتا تھا۔

بارہ طویل علمی نشستوں پر محیط ان خطبات کو سننے کے بعد مجموعی طور پر سامعین کی جانب سے

تقریباً پونے دو سو سوالات کئے گئے۔ ان تمام سوالات کے جواب دیتے وقت ڈاکٹر صاحب نے تہذیب و شائستگی اور علمی شکوہ کے ساتھ ساتھ تواضع اور انکساری کے جس اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کیا وہی دراصل ہم سب کے سیکھنے کی چیز ہے اور یہی بنیادی طور پر اس تحریر کی غرض و غایت بھی ہے۔ آج ہم سب کو اپنی زندگیوں میں اسی معیار کی سیرت اور کردار کو مشعل راہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے طرز استدلال، انداز گفتگو اور لہجہ اور اسلوب عمل کا بغور جائزہ لیا جائے تو آپ کے تمام معتقدین اور فکری تلامذہ کے لئے بالخصوص دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے درج ذیل بنیادی اصول سامنے آتے ہیں۔

۱۔ سوال کسی بھی نوعیت کا ہو اس کو پوری توجہ سے سننا، اہمیت دینا اور اس کا خالص علمی اور سنجیدہ انداز میں جواب دینا۔

۲۔ لایعنی اور فضول قسم کی باتوں پر بھی تحمل، بردباری اور وقار کا مظاہرہ کرنا۔

۳۔ تقابل ادیان کے ٹھوس، وسیع اور گہرے مطالعہ کی بنیاد پر اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے شکوک و شبہات اور ظنون و اوہام کا مکمل ادراک حاصل کرنا اور کسی کی بھی نیت پر حملہ کئے بغیر اس کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا مکمل اور شافی جواب فراہم کرنا۔

۴۔ مختلف فقہی مسالک و مشارب کے بارے میں وسیع النظری اور احترام آراء کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف مسالک کے مابین ملی یکجہتی، وحدت مقاصد اور زیادہ سے زیادہ فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا، فراخدلانہ انداز میں دوسرے کے نقطہ نظر کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا، اور اہل ایمان کے باہمی اختلاف آراء کو مخاصمت اور منافرت کے جذبہ کے بجائے اخوت اسلامی کی صحیح روح کے ساتھ دیکھنا اور دکھانا۔

۵۔ کسی بھی فرد، جماعت یا قوم کے متعلق مخاصمانہ اور منفی طرز فکر کے بجائے ایک مثبت، تعمیری اور دوستانہ رویہ کا اظہار کرنا۔

۶۔ مسلمانوں کی عمومی حالت پر مایوسی و محرومی کے جذبات ابھارنے کے بجائے مسلمانوں میں اولوالعزمی اور بلند ہمتی پیدا کرنا، اپنے مخاطبین کے حوصلے بلند رکھنا اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں عمومی طور پر پرامید رویہ رکھنا۔

۷۔ علم کی وسعت و گہرائی، فکر و دانش کے اعلیٰ معیارات اور تقویٰ و اخلاص کی بلندیوں اور رفعتوں کو حاصل کر لینے کے باوجود عاجزی اور انکساری کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

۸۔ اہل ثروت و جاہ و اقتدار کے ساتھ وقار، شائستگی اور خیر خواہی کے سلوک کے ساتھ ساتھ عزتِ

نفس اور استغناء کا رویہ رکھنا۔

۹۔ افراد کی دنیاوی وجاہت و عدم وجاہت کا لحاظ کئے بغیر انسان کو بحیثیت انسان کے مکمل عزت اور احترام کا مقام دینا۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب کی دلآویز شخصیت ہمہ جہت پہلوؤں کی حامل تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک کمزور جسم اور نحیف وجود کے ساتھ اپنے زمانے کا ایک عالم باعمل، ایک جید فقیہ و قانون داں، کامیاب مبلغ و داعی، محدث و سیرت نگار، مفسر و متکلم، مرشد و مربی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بہترین انسان بنایا تھا لیکن مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کے روشن کردار میں دو صفتیں ایسی تھیں جو باقی تمام خصوصیات پر فائق، بے حد تابناک اور نہایت متاثر کرنے والی تھیں۔ یہ بات یقیناً پورے وثوق کے ساتھ ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جس کو ان سے براہ راست شناسائی کا شرف حاصل رہا ہو کہ دور جدید میں ان دونوں صفات میں کوئی اور شخص ان کا ثانی اور شریک نظر نہیں آتا۔ ایک تو ان کی ٹھوس علمی حیثیت تھی۔ نصف صدی سے زائد مدت پر محیط ان کے شب و روز علوم اسلامیہ کے بحر ذخّار کی غواصی کرتے ہوئے علم و فکر کے لعل و گہر کی دریافت میں گزر گئے۔ اس طرح ان کی ذات کو اسلامی علوم کے ایک دائرۃ المعارف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ وہ ہر مسئلہ کے بارے میں علمی بنیادوں پر سوچتے، علمی انداز میں گفتگو کرتے اور ہر چیز کو علمی نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علم ہی کی صدائیں ان کے کانوں میں رس گھولتیں اور علمی کارناموں سے ہی ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ ان کی زبان، ان کا ذہن اور ان کا دہن دن رات علم ہی کے موتی اور جواہر لٹاتا تھا۔ ان کے مبارک قدم اس دنیا کے ہر کونہ اور ہر گوشہ میں علم دین ہی کی ترویج اور اشاعت کے لئے اٹھتے تھے۔ اسی مقصد کی تکمیل ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ڈاکٹر صاحب علوم اسلامیہ کے افق پر ایک آفتاب عالمتاب تھے جو نصف صدی تک ایک عالم کو علم کی روشنی سے منور کرتا رہا۔ پیرس میں ان کی مختصر سی رہائش گاہ کو عالم اسلام میں ایک نادر علمی سرچشمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور اس سادہ سے مکان نے ساری دنیائے اسلام کے اہل علم کی نظر میں ایک مرجع کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ آج یہ جگہ ایک تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہے اور ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ ہر اعتبار سے آپ محسن انسانیت ﷺ اور معلم اعظم ﷺ کے عطا فرمودہ سرمایہ علوم و معارف کے حقیقی وارث نظر آتے تھے۔ آپ کی زندگی صحیح معنوں میں سلف صالحین کی سیرت کا بہترین نمونہ تھی۔

ڈاکٹر حمیداللہ ؒ کا علمی مقام و مرتبہ تو اہل علم کے درمیان معروف اور مسلم ہے ہی، لیکن ان کی شخصیت کا دوسرا دلآویز پہلو جس کی مثالیں اس دور میں نادر ہی رہ گئی ہیں، ان کی اعلیٰ سیرت اور

بلند کردار ہے۔ یہی دراصل آپ کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو ان خطبات کے سامعین کے لئے خصوصی طور پر بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھتا تھا۔ ان کا یہ روپ اس قدر متاثر کن تھا کہ خطبات کے دوران جب وقفہ آتا تو لوگ جگہ جگہ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے گہرے تاثرات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں ایک ہی موضوع پر گفتگو کرتے نظر آتے اور وہ موضوع تھا: ڈاکٹر صاحب کی خیرہ کن شخصیت۔ خصوصاً وہاں آنے والی خواتین کے دل تو اس نابغہ روزگار عالم دین اور مجسم اخلاق داعی دین کے لئے بے پناہ تعریف و تحسین کے جذبات سے معمور تھے۔ شاید انہوں نے اس قسم کے جذبات کسی اور کے لئے کبھی اس طرح محسوس نہیں کئے تھے۔

اہل بہاولپور کے درمیان ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے درمیان آ گیا ہو۔ اگرچہ بظاہر ان کے اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ایسا کوئی قریبی رشتہ نہ تھا سوائے دین و ملت کے تعلق کے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر انسانوں کے مابین حقیقی احترام، محبت اور بے لوثی کا کوئی پائیدار رشتہ ہوتا ہے تو وہ دین ہی کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اس تعلق کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے محبت پر استوار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دلوں کو جوڑنے کے لئے حب الٰہی سے بڑھ کر محکم بنیاد اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہ تالیف قلوب اور ذہنی ہم آہنگی ایمان کے ان ثمرات میں سے ہے جو خاص اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی سے عطا ہوتے ہیں اگر اس دنیا کے تمام وسائل خرچ کر دیئے جائیں اور زمین کے سارے خزانے لٹا دیئے جائیں تب بھی کوئی اور تعلق اس رشتہ کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔

> **والّف بين قلوبهم لو انفقت ما فى الارض جميعاً ما الّفت بين قلوبهم ولكن الله الّف بينهم انه عزيز حكيم.**
>
> اور اس نے ہی ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔ اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔ مگر اللہ ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔ بے شک وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ اس سے پہلے ان سامعین میں سے شاید ہی کسی سے ان کا کوئی شخصی تعارف رہا ہوگا، نہ ہی وہاں جمع ہونے والے خواتین و حضرات کی اکثریت ان کی علمی شخصیت اور کارناموں سے کوئی خاص واقفیت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب ہندوستان کی مسلم تہذیب و تمدن کے گڑھ حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے تھے، جہاں کے خواص تو کجا عوام الناس تک اپنے رکھ رکھاؤ، آداب اور نفاست کی بناء پر ہمیشہ سے نمایاں اور مشہور رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر اگر

بہاولپور کی ٹھیٹھ سرائیکی تہذیب اور رہن سہن کو دیکھا جائے تو دونوں علاقوں کے تصورات اور رویوں میں واضح فرق نظر آئے گا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ کے لکھنؤ یعنی پیرس میں گزرا۔ اس کے مقابلہ میں بھی اہل بہاولپور کی تمدنی سطح، بود و باش اور اس سادہ سے شہر میں میسر زندگی کی عام مادی سہولیات کا پیرس شہر کی سہولتوں اور چکاچوند سے کیا موازنہ! عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان ظاہری اسباب اختلاف و تفاوت کے باوصف ڈاکٹر صاحب اور ان کے بہاولپوری سامعین کے درمیان محبت، اپنائیت اور دلی یگانگت کا مضبوط رشتہ بہت مختصر وقت ہی میں قائم ہو گیا تھا اور جانبین سے اس خصوصی تعلق کا واضح اظہار ہو رہا تھا۔ ان سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر روح کو ایسا سکون مل رہا تھا جیسے کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آ بیٹھے ہوں اور بہاولپور کے تپتے ہوئے، خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں یکا یک نخلستان کا کوئی ٹکڑا اتر آیا ہو۔

ڈاکٹر صاحب علم کا ایک ایسا کوہ گراں تھے جن کے سامنے موجود ہر شخص ہی اپنے کو ایک ذرہ ناچیز سمجھ رہا تھا۔ آپ اسلام کی آفاقی اخلاقی اقدار کا ایسا بلند و بالا مینار تھے جس کے مقابلہ میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی ہستی کچھ بے معنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ علم کے میدان میں تو بہت سے لوگ جھنڈے گاڑ ہی لیتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کو اپنے زمانہ میں جو غیر معمولی پذیرائی اور کامیابی حاصل ہوئی اس کا سبب یوں لگتا ہے کہ یہی زریں اخلاقی صفات تھیں جن سے آپ کی شخصیت مزین تھی اور جس نے آپ کو گزشتہ صدی کی محبوب ترین اور معزز ترین ہستی بنا دیا تھا۔

بہاولپور شہر میں قیام کے دوران عموماً ڈاکٹر صاحب کے صبح کے اوقات آپ کی جائے قیام یعنی سرکٹ ہاؤس میں ہی گزرتے تھے۔ ان اوقات میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اکیلے رہے ہوں، بلکہ لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر آپ سے ملاقات کے لئے بڑے اشتیاق اور اہتمام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے اور مختلف دینی موضوعات اور علمی مسائل کے متعلق آپ سے مسلسل رہنمائی حاصل کیا کرتے۔ ملاقاتیوں کو بلالحاظ عمر، عہدہ یا اہلیت کے آپ پوری سخاوت سے وقت دیا کرتے تھے اور مکمل توجہ کے ساتھ کامل شفقت سے ان کی بات سن کر پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ ان کی ہر ممکن علمی مدد اور دینی رہنمائی فرماتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یونیورسٹی کے کسی شعبہ کی طرف سے آپ کو دعوت دی جاتی اور آپ اس شعبہ میں خاص طور سے تشریف لاتے اور اس کے اساتذہ، محققین، طلباء اور طالبات کی رہنمائی فرماتے۔

ڈاکٹر صاحب دعوتوں اور ضیافتوں کے جھمیلوں میں بہت زیادہ پڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی

طرح جن امور میں آپ کی جانب سے قدرے سختی کا مظاہرہ ہوتا تھا وہ اپنے ملنے والوں سے تحفے تحائف وصول کرنے کا سلسلہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ آپ اپنے میزبانوں پر اپنی وجہ سے کسی بھی قسم کا بار ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اعزاز میں وہاں نہ تو بہت زیادہ دعوتوں ضیافتوں کا انتظام کیا گیا اور نہ ہی بیش قیمت تحائف اور ہدایا کا اہتمام کیا گیا۔ صرف چند گھر ہی ایسے تھے جن کے مکینوں کی دعوت کو ڈاکٹر صاحب نے شرف قبولیت بخشا اور جہاں ڈاکٹر صاحب تناول طعام کے لئے تشریف لے گئے ان میں راقمہ کا گھر بھی شامل تھا۔ اس موقع پر ان کے لئے مرچ مصالحوں سے پاک کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب مرچ مصالحہ سے پرہیز فرماتے تھے۔ دعوت کے دوران میری ایک دیرینہ سہیلی اور کرم فرما محترمہ پروفیسر صبیحہ خاکوانی صاحبہ (حال وائس پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج بہاولپور) نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان کی رہائش گاہ پر بھی تشریف لائیں اور خواتین کو اپنی اقتداء میں نماز ادا کرنے کا موقعہ عنایت فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت شفقت سے ان کی درخواست کو منظور فرمایا اور ان کے گھر تشریف لے جا کر وہاں موجود خواتین کو مغرب کی نماز پڑھائی۔ اس موقعہ پر صبیحہ خاکوانی صاحبہ نے تحفہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک قلم پیش کرنا چاہا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسے قبول کرنے سے معذرت فرما دی۔

ڈاکٹر صاحب کو مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ بہاولپور کی مقامی زبان سرائیکی میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ ہو چکا ہے تو انہوں نے اس کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کی اس خواہش کا علم ہوتے ہی ان کے کئی نیازمندوں نے بڑی سرعت کے ساتھ بازار کا رخ کیا۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ سب سے پہلے یہ نسخہ حاصل کر کے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر لے۔ یوسف فاروقی صاحب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اس لئے کہ وہ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی کے فرائض کی انجام دہی پر مامور تھے، اس وجہ سے انہیں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضری کے مواقع دوسرے حضرات کے مقابلہ میں زیادہ مل جاتے تھے۔

یہاں شاید اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ راقمہ حروف کو ڈاکٹر صاحب کی بلند پایہ اور وقیع تصنیف Muslim Conduct of State کا اُردو ترجمہ مکمل کرنے کی سعادت انہی دنوں حاصل ہوئی تھی۔ یہ اُردو ترجمہ تقریباً پانچ صد صفحات پر مشتمل ایک مسودہ کی شکل میں تھا۔ میرے بڑے بھائی اور استاد ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے وہ مسودہ ایک شب اصلاح کی غرض سے ڈاکٹر صاحب کی

خدمت میں پیش کیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا کمال تھا یا ان کے وقت میں دی جانے والی خصوصی برکت کہ ایک ہی رات میں آپ نے نہ صرف پورے مسودہ کو ملاحظہ فرما لیا بلکہ جا بجا ضروری اصلاح بھی فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی بکمال شفقت ایک مختصر سی تحریر بطور پیش لفظ کے بھی آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر عنایت فرمائی جس میں حوصلہ افزائی کے بعض تحسین آمیز کلمات بھی شامل تھے۔ راقمہ اس پذیرائی کی نہ توقع کرتی تھی اور نہ ہی اپنے کو اس کا مستحق گردانتی تھی۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر کرنے سے میرا مقصد صرف آپ کی اس عظمت اخلاق پر روشنی ڈالنا ہے جس کی بناء پر نوآمیزوں اور خوردوں پر غیر معمولی توجہ اور شفقت آپ کے رویہ میں ہر موقعہ پر انتہائی بھرپور طریقے سے ظاہر ہوتی تھی۔

انہی دنوں میں یہ مسودہ طباعت کے لئے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی جلد از جلد اشاعت کے لئے بے حد خواہاں تھے۔ اپنے ایک مکتوب گرامی میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اگر ادارہ کتاب کی طباعت میں تاخیر سے کام لے رہا ہے تو یہ مسودہ اُردو اکیڈمی سندھ کو دے دیا جائے۔ (غالباً اُردو اکیڈمی کے ارباب اختیار نے ڈاکٹر صاحب سے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی کا اظہار بھی کیا تھا) ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ ترجمہ جلد از جلد شائع ہو کر اُردو داں قارئین تک پہنچ جائے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے اکثر علمی اور ادبی ادارے خشک سالی، بنجر پن اور نااہلی کا شکار اس وقت بھی تھے اور آج تک ہیں۔ محض اُردو اکیڈمی کے بعض ذمہ دار افراد کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے وہ مسودہ جس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے مبارک قلم سے اصلاح فرمائی تھی اور جس میں ان کے اپنے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا نادر پیش لفظ بھی تھا ان لوگوں سے گم ہو گیا۔ یہ ایک قلمی مسودہ تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور نسخہ دستیاب نہ تھا اس لئے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

ترجمہ کی بابت گزارشات محض ایک جملہ معترضہ کے طور پر آ گئیں کیونکہ اس کام کی سعادت مجھے نصیب ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ مسودہ کے ضیاع کا افسوس بھی مجھے ہی سب سے زیادہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بے اختیار اس افسوس ناک واقعہ کا ذکر نوک قلم پر آ گیا۔

تقریباً دو ہفتہ جاری رہنے کے بعد تاریخی اور ناقابل فراموش خطبات بہاولپور کا یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا اور ڈاکٹر صاحب واپس پیرس تشریف لے گئے لیکن نہ صرف ان خطبات کے سامعین بلکہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے وابستہ اساتذہ، طلبہ اور شہر کے تمام علم دوست حلقوں پر ڈاکٹر صاحب اپنی علمی وجاہت اور اخلاقی رفعتوں کے ایسے انمٹ نقوش اور نشان چھوڑ گئے جو ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔